POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 03-04 March 2024, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85 واں سال

Date of Publication: 02-03-2024 • Price: 5/- • 8-14 March 2024 • Issue: 10 • Vol:83

۸۔۱۴ مارچ ۲۰۲۴ء • شمارہ ۱۰ • جلد ۸۳

ارضِ گورکھپور کی مٹّی کا شاعر: ظفرؔ گورکھپوری

اشتیاق سعید

5 مئی 1935 کو گورکھپور کی تحصیل بانس گاؤں کے موضع بیدولی بابو میں رحم علی انصاری کے یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرزند نرینہ کا تحفہ عطا کیا۔ حالاں کہ اس مبارک ساعت میں رحم علی اپنے ابا سے تقریباً سوا سو کلومیٹر کے طویل فاصلے پر بمبئی سٹی کی ایک کپڑا مل میں کام کرنے میں مصروف تھے۔ گرچہ کپڑا بُننا اور کاشتکاری ان کا آبائی پیشہ تھا، گاؤں میں خاصی زرعی زمینیں تھیں۔ البتہ کاشتکاری کے علاوہ گھر کے بنے دریاں اور چادریں بنتے پھر ہفتے کے دن بازار میں بیچ آتے جس سے اوپر کے اخراجات کی تکمیل ہوتی، کھانے بھر اناج اور ساگ سبزی کھیتوں سے میسر آ ہی جاتے تھے۔ کساد بازاری نے جب پاؤں پسارے تو حالات کی چادر چھوٹی معلوم ہوئی۔ سال دو سال کھینچ تان کر پاؤں ڈھکنے کی حتی الامکان کوشش ہوئی لیکن چادر تو چادر! جہاں تہاں سے مسکنے لگی۔ بالآخر عزت نفس اور آبرو کے اجداد کے رخصت ہو جانے کا احساس دامن میں شور مچانے لگا تو چادر کی معیشت کی وجہ اور مناسب ناپ کی چادر کی حصول میں رحم علی نے شہر بمبئی کا رخ کیا۔ یہ سن 1928 کے آخری مہینے کی بات ہے۔ بخت نے یاوری کی چند مہینوں ہی کی تگ و دو، مشقت اور فاقہ مستی کے بعد بمبئی کے مضافاتی علاقے کرلا میں واقع ایک کپڑا مل میں بہ حیثیت بنکر ملازم ہو گئے۔ شروع شروع کے کئی ماہ عارضی ملازم کی حیثیت رہی، پھر ان کی محنت، لگن، ایمانداری اور پابندیٔ وقت نے انھیں مستقل ملازم کا درجہ عطا کیا۔

رحم علی شروع ہی سے ماہ بہ ماہ ملنے والی تنخواہ سے کچھ روپے اپنے اخراجات کے لیے رکھ لیتے اور بقیہ رقم والد محترم کے نام منی آرڈر کروا دیا کرتے۔ اس طرح دو سال کا عرصہ گزر گیا، رحم علی نے مل سے کوئی چھٹی لی نہ ہی گاؤں جانے کی بابت سوچا۔ جب کہ ان کے ساتھی ہر سال یا سال دو سال پر دو ماہ کے لیے چھٹی کی درخواست دے کر اپنے اپنے گاؤں ضرور جاتے لیکن رحم علی کو روپیہ کمانے کی ایسی دھن تھی کہ وہ چاہ کر بھی پانچ سال تک گاؤں نہ جا سکے۔ ان کی اس جفاکشی اور مستقل مزاجی سے خوش ہو کر مل انتظامیہ نے انھیں دو ماہ کی چھٹی مع تنخواہ، سفر کے اخراجات بطور انعام دیے۔ یہ اپریل 1934 کی بات ہے۔ بہر حال! مل انتظامیہ کی اس نوازش سے مسرور ہو کر رحم علی نے گاؤں کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ ان کا گاؤں پہنچنا تھا کہ آناً فاناً میں سہرا باندھ دیا گیا اور یوں ان کی ازدواجی زندگی کی بنیاد ڈال دی گئی۔

بہر حال صاحب اولاد ہونے کی نوید انھیں اللہ نے سنائی تھی۔ سنتے ہی سرور و انبساط نے بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو کر مولود کے بخت آور ہونے کی دعا کی اور ظفر الدین نام تجویز کیا۔ گھر کے تمام افراد نے اس نام کو پسند کیا اور نومولود جس کو اب تک 'بابو' کہہ کے بلایا جاتا تھا، ظفر الدین کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ظفر الدین کا بچپن گاؤں کی مٹی میں کھیلتے کودتے، پاؤں پاؤں چلنے کی چاہ میں گرتے سنبھلتے، دادا کے کندھے پر سوار ہو کر کھیتوں کا نظارہ کرتے، دادی کی انگلی تھامے میلوں کی پگڈنڈیوں پر چہل قدمی کرتے گزرا۔ جب عمر کی پانچویں منزل میں داخل ہوئے تو دادا نے انھیں گاؤں کے مکتب میں بٹھا دیا۔ جب چار جماعتیں پاس کر لیں تو مزید تعلیم کی خاطر والد محترم انھیں اپنے ساتھ بمبئی لے آئے اور انجمن اسلام ہائی اسکول، کرلا میں داخل کرا دیا۔ اس وقت ان کی عمر 9 برس تھی۔ 1944 کا زمانہ تھا، ہندوستان تحریک آزادی کی سمت گامزن تھا۔

ظفر الدین نے 15 اگست 1947 کی وہ سنہری صبح دیکھی جسے آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور خاک و خون میں لت پت وہ سیاہ راتیں بھی دیکھیں جو تقسیم وطن کے سبب فسادات کی شکل میں نمودار ہوئے تھے۔ ان بھیانک اور کربناک مناظر نے ظفر کے کچے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ دن رات اس بابت سوچا کرتے تھے کہ آخر یہ مذہبی منافرت کیوں ہے؟ کیوں ایک مذہب کا آدمی دوسرے مذہب کے آدمی کو بے رحمی سے قتل کر دیتا ہے؟ کیوں اس کی بیوی بچوں کو بے یار و مددگار بنا دیتا ہے؟ آخر ایسا کر کے اسے ملتا کیا ہے؟ پھر یہ سب کچھ دیکھتا ہے، دوسرا روتا کیوں نہیں؟ برخلاف اس کے ظفر نے گاؤں میں یکجہتی و بھائی چارے کا ماحول دیکھا تھا، وہاں ہندو مسلم میں کسی قسم کا کوئی بھید بھاؤ نہ تھا، سب مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے درمیان ساجی اور تہذیبی رشتوں کی مضبوط کڑی تھی۔ ہولی، دیوالی، عید اور محرم سب مل جل کر مناتے تھے۔ مسلمان ہندوؤں کی خوشیوں میں شامل رہتے تو ہندو بھی چاؤ سے میلاد سننے آتے تھے۔ لیکن یہاں بمبئی میں؟

وہ کچی عمر میں ہی ذہنی الجھن میں مبتلا رہے تھے۔ اس سے ان کی تعلیم بھی متاثر ہوئی۔ ظفر کے ایک ہم جماعت اکرم قریشی صاحب جو میرے استاد بھی تھے، انھوں نے ایک مرتبہ مجھے ظفر کے متعلق سے بتایا تھا کہ ظفر جماعت میں سب سے زیادہ حساس، خوش طبع اور ذہین طالب علم تھا، وہ مجھ سے اکثر دل کی باتیں کیا کرتا تھا۔ باتیں بھی کیا ہوتیں، وہ گاؤں کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اس کا دل کھیتوں، کھلیانوں، باغوں اور تالابوں میں اٹکا ہوا تھا اور وہ اسی زمانے میں اپنے منتشر خیالات کو شعروں میں پرونے لگا تھا۔

ظفر گورکھپوری نے باقاعدہ شاعری کا آغاز 1951 میں کیا۔ تخلیقات گاہ گاہ مقامی اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ پھر 1955 میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے۔ یہاں انھیں سجاد ظہیر، کرشن چندر، مہندر ناتھ، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، ظ۔ انصاری اور کیفی اعظمی کا ساتھ میسر آیا۔ جس سے ان کی ذہنی کیفیت تبدیل ہوئی اور فکر و شعور کو نئی سمت عطا ہوئی۔ پھر تو ظفر پوری یکسوئی اور تن دہی کے ساتھ اپنے ذہن میں منتشر تمام واقعات و خیالات کو شعری پیکر میں ڈھالنے لگے۔ کچھ نظموں کے قالب میں ڈھلیں تو کچھ نے غزلوں کا روپ دھارا۔ پھر کیا تھا، ان کی تخلیقات مقامی اخبارات سے نکل کر ہندوستان بھر کے رسائل و جرائد کی زینت بننے لگیں۔ 1962 میں ان کا اولین شعری مجموعہ 'تیشہ' انجمن ترقی پسند مصنفین، گورکھپور کی تحریک سے منظر عام پر آیا اور خاص و عام میں مقبول ہوا۔ 1970 میں انھوں نے ایک فلم کے لیے مشہور قوال یوسف آزاد اور رشیدہ خاتون کے لیے ایک قوالی لکھی: 'ایسے بے شرم عاشق ہیں یہ آج کے، ان کو اپنا بنانا غضب ہو گیا۔' یہ قوالی فلم میں شامل کی گئی تھی جو بے حد مقبول ہوئی اور اس کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے۔ بعد ازاں دوسری قوالی 'کیا لطف تو جب ہے کہ تو بھی ...' فلم 'نوری' میں شامل کی گئی تھی وہ بے حد مقبول ہوئی۔ باوجود اس کے ظفر بہ سہولت بمبئی میں گزر کر رہے

شہری چال ڈھال اور ریت رواج کو اپنا نہ سکے۔ وطن کی مٹی ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ تصور میں بھی اس سے چھٹنے کبھی سوچتے بھی سوال تو بھی شکایت کرتے:

مٹی تجھ سے کیا رشتہ ہے جس دن ہم نے چھوڑا گاؤں
دیر تلک دیواریں روئیں اور تک ساتھ آیا گھر

تغافل کیش ابھونے سے بھی تو نے یہ سوچا ہے
ترقی بے اتفاقی در پے آزار ہے اب تک

وہ اک شعلہ نوا شاعر جسے ٹھکرا دیا تو نے
وہ شاعر بمبئی میں بے در و دیوار ہے اب تک

واقعی ظفر بمبئی میں عرصہ دراز تک بے گھری کے شکار رہے۔ اب ایسا بھی نہ تھا کہ ان میں گھر خریدنے یا بنوانے کی سکت نہ تھی، وہ چاہتے تو اچھا اور بڑا گھر لے سکتے تھے۔ بمبئی میونسپل کارپوریشن کے شعبۂ تعلیم میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، مستقل ملازمت تھی۔ تنخواہ کے علاوہ مشاعروں نیز اخبارات و رسائل میں تخلیقات کی اشاعت سے بھی کچھ روپے ہاتھ آتے تھے۔ مگر وہ گھر لیتے کیسے! وہ تو بمبئی میں گھر کو قید خانہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل گھر گاؤں میں تھا جہاں سے ان کی جڑیں وابستہ تھیں، جہاں جانی پہچانی گلیاں تھیں، جن میں اجداد کے قدموں کی آہٹ بسی تھی، کھیتوں کھلیانوں میں بہنے والی ہواؤں میں ان کے سانسوں کی مہکاریں شامل تھیں۔ بمبئی اس کے شہری گلیاں ان کے لیے ہمیشہ اجنبی رہیں۔ ان سے کبھی آشنائی ہونے نہ پائی، تا عمر وہ خود کو یہاں اجنبی سمجھتے رہے۔ جب کبھی ان کو کوئی اس شہر سے اچاٹ ہو جاتا، گھٹنے پڑے جاتے [illegible] یا ان پر اضطراری کیفیت طاری ہو جاتی تو وہ مجھ ناچیز کو فون کرکے بلا لیتے اور دیر تک گاؤں گھر کی باتیں مجھ سے ساجھا کرتے۔ یوں بھی میں ہر تعطیل شام ان سے ملنے اندھیری (لوکھنڈوالا) جایا کرتا، وہ بالکل اسی طرح میری آمد کے منتظر ہوتے جیسے اپنے بیٹے خالد کے سعودی عرب سے آنے پر ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں فون کیا اور جلد از جلد گھر آنے کی درخواست کی۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو دیکھا وہ صوفے پر نیم دراز ہیں، سرہانے بیٹی پروین بیٹھی سر دبا رہی ہے اور پاس بیٹھی ان کی بیگم پیروں میں تیل کی مالش کر رہی ہیں۔ انھیں اس کیفیت میں دیکھ کر مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ آپ بے طرح پریشان ہیں، غالباً ڈپریشن میں جا رہے ہیں۔ اسی آن میں نے انھیں سلام کیا، وہ میری آواز سنتے ہی چونک کر اٹھ بیٹھے گویا انھیں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پھر دیر تک چائے کی چسکیوں کے درمیان حال دل بیان کرتے رہے، حالات کی ستم ظریفی سے لے کر مہنگائی سب پر شکایت کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے مجھ سے انداز بدلتے ہوئے کہا: "اشتیاق جب آدمی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تو [illegible] اسی طرح میں بھی یہاں ایک چلتی پھرتی لاش کی صورت ہوں، کیوں کہ میری روح تو میرے گاؤں میں ہی ہوتی ہے۔ آپ ہی کے [illegible] کھیتوں میں [illegible] کرتی ہے، بارش میں بھیگ کر دھان کی روپائی کرتی ہے، کھلیانوں میں گیہوں کی فصل بیلوں [illegible] اور بیل گاڑی پر سفر کرتی ہے۔"

کہاں رکی ہو گی [illegible] کھل چکے ہو جائیں گے
بیل گاڑی سے لیٹ کے [illegible] سڑک پہ گاؤں تک

وہ اس بات کے معترف ضرور تھے کہ بمبئی نے انھیں مادی طور پر خوب نوازا۔ جہاں شہرت [illegible] سے مالا مال کیا، وہیں ان کے [illegible] رنج و الم [illegible] گاؤں گورکھپور سے گہرا [illegible]

لگائی اور بمبئی سے سوال بھی کیا:

اے خاک وطن، او ارض گورکھپور کی مٹی
مجھے پردیس کے غم سے چھڑا لیتی تو اچھا تھا
میں اک چلتا ہوا لاشہ ہوں ان انجان گلیوں میں
تو اس لاشے کو چھاتی سے لگا لیتی تو اچھا تھا

سالم تھا اپنے گاؤں کی کچی سڑک پہ میں
ٹکڑوں میں کس نے بانٹ دیا بمبئی سے پوچھ

ظفر گورکھپوری کی اس گہار سے بمبئی قدرے شرمسار ہوئی۔ پھر انھیں شہر کے مہنگے اور شاندار علاقے اندھیری شاستری نگر میں تمام آسائش سے مزین ایک عالی شان فلیٹ سے نوازا۔ فلیٹ کی رہائش اختیار کرکے بیوی بچے پھولے نہ سماتے تھے۔ ظاہری طور پر ظفر بھی ان کی خوشی میں شامل رہتے لیکن ان کا باطن زار زار روتا، ضمیر کچوکے لگاتا اور داخلیت تڑپتی رہتی، اسی سبب وہ زیادہ تر فلیٹ سے باہر دوستوں یاروں کے ساتھ وقت گزار کر سکون محسوس کرتے۔ یا یوں کہوں تو زیادہ بہتر ہے کہ وہ صرف شب باشی کے لیے اس انداز سے فلیٹ پر آتے گویا وہ گھر نہیں کوئی سرائے ہو۔

خواب گاہ میں نرم و ملائم مخملی بستر پر لیٹتے تو چند لمحوں بعد یوں محسوس ہوتا گویا ان میں کانٹے اگ آئے ہوں جن سے گھبرا کر نیندیں گاؤں کے سیوان میں بھٹکنے لگتیں۔ یکایک تصور کے پردے پر گاؤں کا کچا گھر روشن ہو جاتا اور وہ خود کو کھپریل میں بادھ کی کھری چارپائی پر تو کبھی کھلیان میں دوری گئے ہوئے گیہوں کے بھوسے پر لیٹے ہوئے دیکھتے اور خوب حظ اٹھاتے گو رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹنی پڑتی۔ ایسے میں گرلا کی کھلی شدت سے یاد آتی۔ شاید اسی لیے انھوں نے کہا ہے:

چھت ٹپکتی تھی اگرچہ پھر بھی آ جاتی تھی نیند
میں نئے گھر میں بہت رویا پرانے کے لیے
بانس کے کچے مکاں نے مجھ کو جینا تھا ظفر
کانچ کے آراستہ گھر میں مجھے پھانسی لگی

ظفر صاحب سے میرا ساتھ تقریباً تیس برسوں پر محیط ہے۔ وہ جب تک ملازمت میں رہے تب تک جب وقت ملتا چند منٹوں کے لیے ہی سہی میری دکان پر ضرور آتے۔ علیک سلیک کے بعد خیریت دریافت کرتے، اگر گفتگو کا موقع ہوتا تو مختصر بات کرتے اور چلے جاتے، حالاں کہ وہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ تاخیر سے بھی اسکول جاتے تو انھیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتے تو حاضری لگا کر اسکول سے غائب رہ سکتے تھے کیوں کہ افسران اعلیٰ ان کے مداحوں میں سے تھے، لیکن انھوں نے کبھی اس بات کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کے اصول کے مطابق اس طرح کی حرکت سے بچوں کا تعلیمی نقصان تو ہوتا ہی رزق حلال پر بھی آنچ آتی۔

بچوں کے تئیں ان کے اپنے کا عالم یہ تھا کہ انھیں ہیڈ ٹیچر کا پروموشن ملا تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب کہ دوسرے ٹیچر اس پروموشن کے لیے سفارشیں کرواتے ہیں، موٹی موٹی رقمیں بطور رشوت دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس تعلق سے میں نے ایک دفعہ ظفر صاحب سے استفسار کیا تو وہ کہنے لگے: "ہیڈ ٹیچر بننے کے بعد رتبہ تو کچھ ضرور بلند ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی انتظامی امور کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، دو دو تین تین گھنٹے دفتروں اور [illegible] میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ ان کاموں میں الجھنے کا مطلب بچوں کو نظر انداز کرنا۔ جب کہ میں بچوں کو اپنی عمر کے پڑھانا چاہتا ہوں، اور ان کے لیے تخلیقی کام کرنا چاہتا ہوں۔ اشتیاق میاں اب تو معلم تجارت کرنے لگا ہے، لیکن تیس چالیس برس پہلے معلم معمار قوم سمجھا جاتا تھا اس لیے اس پیشے کو ایک طرح کا وقار حاصل تھا، لوگ معلم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔"

ظفر صاحب زمانہ بدل جانے کے بعد بھی معمار قوم بنے رہے اور اس پیشے کے وقار کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ 36 برس ملازمت میں رہے جس میں 30 برس متواتر بچوں کو پڑھاتے ہوئے یکم جون 1993 کو اپنے اس فرض منصبی سے سبکدوش ہوئے۔

تیس برس کی استادی میں اور ظفر ہم دیتے کیا
جیون سے جو آگ ملی تھی، دے گئے باری باری ہے

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ظفر صاحب کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بقیہ زندگی گاؤں کے پرسکون اور خوشگوار ماحول میں گزاریں گے، وہیں اطمینان سے لکھیں گے پڑھیں گے، ساتھ ہی اپنے بچپن کو محسوس کریں گے، گاؤں کی گلیوں، پگڈنڈیوں اور کھیتوں میں اپنے والدین کے نقش پا تلاش کریں گے۔ حیف ایسا ممکن نہ ہو سکا کیوں کہ ان کی شریک حیات بچوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں لہٰذا وہ لاچار ہو گئے اور چار و ناچار اپنی اس خواہش کا بھی گلا گھونٹ دیا اور یہ کہہ کر اپنے آپ کی تشفی کر لی:

آدھی عمر سزا کی طرح کاٹ کے ظفر
اب بمبئی سے اٹھ کے کدھر جایئے گا آپ

ایک دن ظفر صاحب اچانک میری دکان پر آ دھمکے، وہ گھبرائے ہوئے پسینہ پسینہ تھے، سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں، سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ اسی عالم میں کرسی پر دراز ہوتے ہوئے بولے: "جلدی سے پانی منگواؤ۔" اتفاق سے اس وقت دکان میں پانی کا جگ تھا، میں نے فوراً گلاس میں انڈیل کر انھیں تھمایا۔ وہ گلاس لے کر غٹ غٹ غٹ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئے، پھر ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے حکم صادر فرمایا: "اب جلدی سے چائے منگواؤ۔" میں نے جھٹ بغل کے آزاد ریسٹورنٹ میں چائے کے لیے کہا اور ظفر صاحب کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں، جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے کرتا یا بے ترتیب سانسوں کو یکجا کر رہے تھے۔ میں ان کی اس کیفیت سے تردد محسوس کر رہا تھا۔ خیر اسی دوران چائے آ گئی۔ پیالیوں کی کھنک سے انھوں نے آنکھیں کھولیں، اس سے قبل کہ میں پیالی اٹھا کے انھیں پیش کرتا بجائے خود انھوں نے لپک لیا اور ایک چسکی لیتے ہوئے تھکی آواز میں بولے: "اشتیاق اب میرا اپنی زمین، اپنی مٹی سے رشتہ ختم ہوا چاہتا ہے۔"

"مطلب؟" میں نے استعجابیہ لہجے میں استفسار کیا۔

"بیوی بچے گاؤں کا گھر اور کھیت فروخت کر دینے پر بضد ہیں، وہاں سے ملنے والی رقم سے میرا روڈ میں کوئی فلیٹ خریدنا چاہتے ہیں۔"

"تو آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے ان کی ویران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا جہاں خواہشات کی ندی پوری طرح خشک تھی اور اطراف میں اُگے خود رو سرکنڈے اور سرپت بھی مرجھانے سے لگے۔

ظفر صاحب نے چائے کا ایک طویل گھونٹ لیا اور خلا میں تکتے ہوئے نحیف آواز میں بولے: "میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا حاصل! انھیں نہ کہیں غلطی میری اپنی ہی ہے۔ عمر بھر حالات اور وقت سے جو کچھ کمایا اسے بجائے بچوں میں تقسیم کرنے کے سرمایہ حیات جان کر اپنی مٹھی میں سموئے رکھا، آج وہی سرمایہ ریت کی صورت میری مٹھی سے سرک رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد اپنی نمیدہ آنکھوں کو ہتھیلی سے خشک کرتے ہوئے حسب عادت چہک کر بولے: "یار اشتیاق رات میں نے خواب میں اپنا گاؤں دیکھا، آج کا نہیں، وہی پچاس ساٹھ برس پہلے والا گاؤں... خوب جھما جھم بارش ہو رہی ہے، سارے کھیت جل تھل ہو چکے ہیں اور میں، میرے والد، میرے دادا بھیگ کر دھان روپ رہے ہیں۔ اچانک منظر بدل گیا۔ بارش نے بھیانک روپ دھار لیا، ندی نالے، پوکھر تالاب سب بھر گئے، گاؤں میں پانی داخل ہونے لگا، پھر لوگ بھاگ...

(بقیہ صفحہ 7 پر)

عہد ساز شخصیت جلیل ساز

محمد اظہر حیات

حضرت جلیل ساز وسط ہند کے معتبر شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ 7 اگست 2007 کو جب ان کی رحلت ہوئی تو وہ اپنی زندگی کے 76 سرد گرم موسم دیکھ چکے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے۔ قسمت کی ستم ظریفیاں جھیلیں۔ تقدیر کی یاوری کے لطف اٹھائے۔ ناگپور میں بے شمار ادبی چینلش کے روح رواں رہے۔ سماجی و ثقافتی سرگرمیاں برپا کیں اور اس کے محور و مرکز رہے۔

جلیل ساز مرحوم بہت مشّاق شاعر تھے۔ انھوں نے دشت ادب میں عرصہ دراز تک سیاحی کی۔ اس طویل سفر میں انھوں نے نہ صرف شاعری نہیں کی بلکہ شاعروں کی ایک نسل کی ادبی و شعری تربیت بھی کی۔ اس اعتبار سے وہ ایک سرچشمہ تھے جہاں سے تشنگانِ شعر و ادب حسب استعداد سیراب ہوتے تھے۔ وہ دنیائے ادب میں استادی و شاگردی کے رشتے کی قدر کرتے تھے۔ یہ روایت ناگپور میں ان کے دم سے زندہ بھی تھی۔

جلیل ساز کو میں تب سے جانتا ہوں جب میں 7 یا 8 برس کا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے ڈھیلا ڈھالا سفید قمیص پاجامہ پہنے لمبے لمبے بال، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے جلدی جلدی چلتے وہ ہمارے گھر کے سامنے سے جاتے آتے تھے۔ وہ ہمارے گھر کے قریب مومن پورہ کوآپریٹو سوسائٹی میں معمولی تنخواہ پر کلرک تھے۔ اس لیے ان کا آنا جانا روز کا معمول تھا۔ کبھی کبھار میرے والد صاحب کو سلام بھی کر دیتے اور والد صاحب بڑے تپاک سے ان کے سلام کا جواب دیتے۔ ایک روز میں نے والد صاحب سے پوچھ لیا ابا جی یہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے کہا ان کا نام جلیل ساز ہے۔ اچھے شاعر ہیں۔ اچھے شاعر ہیں میرے تحت الشعور میں چپک کر رہ گیا۔ گویا 7 یا 8 سال کی عمر میں میرا ان کا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد تو جلیل ساز صاحب سے میری ملاقات ہر روز ہونے لگی۔

قریبی رشتے داروں میں شادیاں ہوتیں وہ سربراہی کرتے نظر آتے۔ مشاعرہ ہوتا تو وہاں کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوتے۔ تعلیمی جلسوں میں مہمانانِ خصوصی کی صف میں ہوتے اور کبھی سیاسی پارٹی کے جلسوں میں تقریر کرتے نظر آتے گویا ہر جگہ جلیل ساز کا نام سننے کو ملتا۔

1969 میں جب وہ ناگپور کارپوریشن کے وارڈ الیکشن میں کھڑے ہوئے تو دیگر بچوں کے ساتھ میں بھی گلی گلی ’ساز صاحب کو ووٹ دو‘ کے نعرے لگاتے پھرتا رہا۔ ہم نے ان کے لیے خوب محنت کی۔ نتیجہ آیا، ساز صاحب کثیر ووٹوں سے وارڈ کے ممبر منتخب ہو گئے۔ پھر وہ پانچ سال تک اس وارڈ کے معزز ممبر رہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا انھوں نے صرف آٹھویں تک ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی تحریر پڑھ کر، ان کی تقریر سن کر یا ان سے گفتگو کرکے یوں اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈگریاں رکھتے ہوں گے۔

ساز صاحب ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت پرکشش اور جاذب نظر تھی۔ وہ اخلاق کے معاملہ فہم تھے۔ سنجیدگی اور متانت ان کے چہرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ان کا قد ایسا تھا کہ سیکڑوں میں الگ دکھائی جاتے تھے۔ مطالعہ وسیع تھا اور حافظہ غضب کا پایا تھا۔ غالب، اقبال، جگر، فیض، سیماب، ساحر اور شکیل بدایونی کے بے شمار اشعار انھیں ازبر تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے میاں خوش بختی اور اکتساب علم بزرگوں کی صحبت کا فیض ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں ساز صاحب کی تحریر کردہ ’جدائی‘ (نظم) بچے سے دلہن تک کے صدر رنج کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب تک یہ پڑھی نہ جاتی تب تک دلہن وداع ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے پڑھنے والوں کی مخصوص جماعت ہوتی جو پُرسوز ترنم کے ساتھ اس وداعی کو پڑھتے تو سارا ماحول غمگین ہو جاتا اور گھر ماتم کدہ بن جاتا۔ کیا مرد کیا عورتیں، بچے بوڑھے دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ ایک روز میں نے ساز صاحب سے پوچھا حضرت آپ نے یہ گیت کس عالم میں لکھا تھا۔ کہنے لگے عالم والم تو کچھ نہیں تھا بلکہ یہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی وکیل پرویز کی شادی کے موقع پر اس کی بیوی کے میکے والوں کی فرمائش پر لکھا تھا۔ مجھے بھی گمان نہیں تھا کہ اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ یہ وداعی گیت زبان و بیان کے اعتبار سے ایسا پُراثر ہے کہ اگر ساز صاحب صرف یہ گیت لکھ کر ہی چلے جاتے تو ناگپور کی ادبی تاریخ میں ان کا نام درج ہو جاتا۔ ساز صاحب کی خدمات پر غور کریں تو احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ صرف یہی کام کر جاتے تو امر ہو جاتے۔ انھوں نے لڑکیوں کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام سے ایک ڈی ایڈ کالج کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے سیکڑوں نہیں ہزاروں بچیوں نے ڈی ایڈ کیا اور برسر روزگار ہوئیں۔ اب سے 50 سال قبل لڑکیوں کے لیے کالج کھولنا گناہ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ سماج میں کالج کے معنی محض عیاشی کا اڈہ تھے۔ ساز صاحب نے معاشرے کے ان طعنوں کی پروا بھی نہ کی اور ڈی ایڈ کالج قائم کر دیا جو آج بھی شان سے جاری ہے۔ اگر ہم کہیں کہ ساز صاحب صرف یہی کام کرکے دنیا سے رخصت ہو جاتے تو اہل ناگپور ان کے احسان کو کبھی نہ بھولتے۔ ان میں انتظامی صلاحیتیں بھی خوب تھیں۔ وہ بیک وقت ڈی ایڈ کالج کے صدر کے ساتھ مجیدیہ گرلز اسکول ناگپور کی مجلس انتظامیہ کے صدر اور یتیم خانہ مدرسہ مومن پورہ کے سکریٹری بھی تھے۔ اس کے علاوہ شہر کی بے شمار ادبی و سماجی سرگرمیوں سے وابستہ تھے۔ ساز صاحب سادہ مزاج اور ملنسار تھے۔ ان میں غرور نام کو نہیں تھا۔ وہ ہر خاص و عام سے یکساں پیش آتے۔ محلے کے لڑکوں سے ایسی باتیں کرتے گویا وہ ان کے ہم راز ہوں۔ ان کا ذہن ہمیشہ ادبی، علمی، تعلیمی و سیاسی سرگرمیاں کرنے پر آمادہ ہوتا۔ دراصل ناگپور میں بیشتر سماجی و ثقافتی سرگرمیاں ان کے دم سے رواں دواں تھیں۔ رمضان کا مہینہ آتا مومن پورہ میں گہما گہمی اور چہل پہل اپنے شباب پر ہوتی۔ اس عالم میں نوجوان لڑکوں کی ٹولی قصیدہ پڑھنے نکلتی۔ جس میں اور طرز پر حالات حاضرہ پر چوٹیں ہوتیں۔ بیشتر قصیدے ساز صاحب کے تحریر کردہ ہوتے جو رات میں پڑھے جاتے اور راتوں رات پورے شہر میں مشہور ہو جاتے۔ انھوں نے دولہوں کے لیے سہرے بھی خوب لکھے۔ اگر ان سہروں، قصیدوں، وطن کے گیتوں اور قومی نظموں کو یکجا کیا جائے تو ساز صاحب کی شاعری کے حوالے سے سماجی منظر نامہ بھی مرتب ہو سکتا ہے۔ انھیں اردو اور اردو کے لکھنے والوں سے والہانہ محبت تھی۔ وہ شہر کے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے۔ میری کتاب ’حافظ ولایت اللہ حافظ: حیات و خدمات‘ شائع ہوئی تو میں نے اس کی ایک جلد ان کی خدمت میں پیش کی۔ فوراً جیب سے 100 روپے نکالے اور مجھے عنایت کیے۔ میں نے کہا حضرت اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کہنے لگے دیکھو جب بھی کوئی مصنف یا شاعر کتاب دے تو اس کو یہ ضرور دیا کرو۔ ہاں ایک زمانہ تھا کہ میری مالی حالت اس قدر خراب تھی کہ مجھے کتابیں مانگ کر پڑھنی پڑتی تھیں مگر اب تو اللہ کا فضل و کرم ہے۔ میں نے کہا حضرت اس کی قیمت تو صرف 20 روپے ہے۔ کہنے لگے میں قیمت کب دے رہا ہوں۔ یہ قبول کرو اور زبردستی میری جیب میں سو کا نوٹ ڈال دیا۔

مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام اردو طنز و مزاح پر ایک سیمینار تھا۔ بڑے بڑے اشتہارات شہر میں چسپاں تھے۔ محترمہ شفیقہ فرحت، محترمہ زرینہ موسوی اور ڈاکٹر شیخ رحمن اکولوی کے نام اس میں شامل تھے۔ ساز صاحب اس کے کنوینر تھے۔ میں نے ساز صاحب سے سرراہ یوں ہی کہہ دیا کہ ساز صاحب میں بھی طنز و مزاح لکھتا ہوں آپ مجھے بھول گئے۔ کہنے لگے ہاں بھائی تمہارا نام رہ گیا۔ لیکن تم اپنی تحریر ضرور پڑھو گے اور پھر شام میں میرے نام سے علاحدہ ایک دعوت نامہ خود لے کر آئے اور اصرار کیا کہ تمھیں اس سیمینار میں ضرور شرکت کرنی ہے۔

ساز صاحب کا مجموعہ کلام ’نگاہ‘ 20 اگست 2002 کو منظر عام پر آیا۔ اجرا کی تقریب ہندی مور بھون سیتا بلڈی میں تزک و احتشام سے منعقد کی گئی۔ کامریڈ اے بی بردھن کے ہاتھوں اجرا ہوا۔ محترم شمیم فیضی دہلی سے، ’شگوفہ‘ کے مدیر مصطفیٰ کمال حیدرآباد سے، بابن بی اے مالیگاؤں سے اور عبدالاحد ساز ممبئی سے بطور خاص تشریف لائے تھے۔ میں نے کثیر الاشاعت مراٹھی روزنامہ ’دیش اُنتی‘ میں ساز صاحب کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹر کرن دھوڑے کے تعاون سے ایک مضمون مراٹھی میں لکھا جو اسی دن شائع ہوا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے جو کام اردو والے نہ کر سکے مراٹھی والوں نے کر دکھایا۔

ساز صاحب کی شخصیت کو ان کی شاعری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی زندگی کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کی شاعری دراصل ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ ان کے کلام میں عصری آگہی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں گرد و پیش کی زندگی کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔ وہ فلسفی نہیں تھے اور نہ ہی فلسفیانہ شاعری کرتے تھے۔ سیدھی سادی زبان میں بات کہتے۔ سماجی زندگی کی ناہمواری، استحصال، جبر، ستم ظریفی، درماندگی اور ہمارے سماج و معاشرے کی بے بسی ان کی شاعری کا موضوع تھے۔ میرے اس دعوے کو پرکھنا ہو تو ان کے مجموعہ کلام ’نگاہ‘ پر نظر ڈالیے۔ ہر غزل میں ایسے اشعار ضرور مل جائیں گے جو نگاہ کے ذریعے دل میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بساط یہ ہے کہ بس ایک مشت خاک ہیں ہم
کمال یہ ہے کہ کون و مکاں پہ چھائے ہیں

تمھیں خوشی کی تمنا تھی، سو ملی تم کو
خدا نے بخشی متاعِ غم حیات مجھے

ملو تو ساز خلوص اور سادگی سے ملو
نہیں پسند یہ بے جا تکلفات مجھے

اردو دنیا

کثیر تعداد میں اساتذہ کے عہدوں پر تقرری کے لیے
ڈی ایس سی نوٹیفکیشن جاری

حیدرآباد (29 فروری)۔ تلنگانہ میں اساتذہ کے عہدوں پر تقرر کے لیے ڈی ایس سی نوٹیفکیشن جاری کیا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ ریونت ریڈی نے وزیر کومٹ ریڈی وینکٹ، ریڈی اور محکمہ تعلیم کے عہدیداروں کے ساتھ اپنی رہائش گاہ پر یہ نوٹیفکیشن جاری کیا۔ 11,062 عہدوں میں اسکول اسسٹنٹ کے 2,629، لینگویج پنڈت کے 727، پی ای ٹیز کے 6508، خصوصی زمرے میں اسکول اسسٹنٹ کے 220، ایس جی ٹی کے 796 عہدے شامل ہیں۔ درخواستیں 4 مارچ سے 3 اپریل تک قبول کی جائیں گی۔ حکومت نے درخواست کی فیس 1000 روپے مقرر کی ہے۔ امتحانات ریاست بھر کے گیارہ شہروں میں آن لائن لیے جائیں گے جس کے لیے حکومت کی جانب سے جلد ہی تاریخوں کا اعلان کیا جائے گا۔ جن امیدواروں نے پہلے درخواست دی ہے انھیں دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ گزشتہ سال ریاستی حکومت نے 5,089 عہدوں کے ساتھ گزشتہ سال 6 ستمبر کو جاری کردہ ڈی ایس سی نوٹیفکیشن کو منسوخ کرنے کے احکام جاری کیے تھے۔ اضافی عہدوں کے ساتھ یہ نوٹیفکیشن جاری کیا گیا ہے۔ مکمل تفصیلات ویب سائٹ http://schoolcdu telangana.gov.in پر دستیاب رہیں گی۔ معلوماتی بلیٹن 4 مارچ سے اس ویب سائٹ پر دستیاب رہے گا جس کو مفت ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس ویب سائٹ میں پوری تفصیلات بھی دی جائیں گی۔ امیدوار کی عمر 18 اور 46 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ محفوظ زمروں کے امیدواروں کے لیے حد عمر میں رعایت رہے گی۔ یہ ٹی ایس ڈی ایس سی اعلامیہ 2024 کے اوائل تک سرکاری مکتبوں میں 11,062 عہدوں کو پر کرنے سے متعلق کانگریس حکومت کی مساعی کا حصہ ہے۔ اس ڈی ایس سی کے سلسلے میں آن لائن کمپیوٹر بیسڈ امتحان محبوب نگر، سنگاریڈی، حیدرآباد، میدک، نظام آباد، عادل آباد، کریم نگر، ورنگل، کھمم، نلگنڈہ اور سنگاریڈی میں منعقد کیے جائیں گے۔ ڈی ایس سی کی ویب سائٹ پر پہنچ کر تلنگانہ ٹی ایس ڈی ایس سی نوٹیفکیشن کے لیے اپلائی آن لائن پر کلک کریں۔ درخواست فارم کو صحیح طریقے سے دیکھنے کے بعد مطلوبہ دستاویزات اپ لوڈ کرتے ہوئے آن لائن درخواست فارم کی فیس کی ادائیگی کی جائے۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ دیے گئے وقت سے پہلے درخواست کو مکمل کیا جائے اور اپنے پاس ریکارڈ کے لیے ایک نقل رکھی جائے۔ علاوہ ازیں تلنگانہ ٹی ایس ڈی ایس سی کے لیے ایڈمٹ کارڈ ویب سائٹ سے لیا جائے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر غضنفر اقبال کو راجیہ آسو ایوارڈ تفویض

گلبرگہ (7 مارچ، پی این ایم)۔ سابق گرپلی کی افتتاح کے موجب گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کے زیر اہتمام منعقدہ پر شکوہ تقریب میں ڈاکٹر غضنفر اقبال کو ان کی کتاب 'قومی ستارے' (بچوں کی کہانیاں بچوں کے لیے) کے لیے راجیہ آسو ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ یہ ایوارڈ پچیس ہزار روپے نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر پروفیسر ایچ ایم مہیش (وائس چانسلر) اور جناب احمد علی چانسلر (سابق وائس چانسلر) کے علاوہ دیگر مہمانان خصوصی شریک تھے۔

سائن بورڈ پر اردو رسم خط کے غلط املا پر اہل اردو کی سرد مہری

'مرزا غالب' کا نام 'میر جا غالب' لکھنے سے سوشل میڈیا پر چھڑی بحث، کیا جان بوجھ کر اردو املا میں غلطی کی جاتی ہے؟

نئی دہلی (7 مارچ)۔ سرکاری طرح سے آویزاں کیے جانے والے سائن بورڈ یعنی شہریوں کی سہولت کے لیے سڑکوں کی نشان دہی کے لیے لگائی جانے والی تختیاں جان بوجھ کر غلط املا میں لکھی اور آویزاں کی جاتی ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ صرف اردو زبان میں ہی لکھی جانے والی تختیاں غلطیوں کا پلندہ ہوتی ہیں۔ دہلی اس ملک کی راجدھانی ہے، جہاں ملکی و غیر ملکی افراد کی آمد و رفت رہتی ہے، ایسی غلطیوں سے پُر تختیاں گورنمنٹ کی لاپروائی کو اجاگر کرتی ہیں۔ دہلی کی شاہراہوں پر لگے سائن بورڈ کو دیکھیں تو ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بالکل درست لکھا جاتا ہے، حالاں کہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ صرف مسلم نام ہی غلط ہوتے ہیں جب کہ اگر وہی اردو میں دیگر تحریر ہوں تو وہ ٹھیک ہوتے ہیں، ایسے میں افسران کا تعصب عیاں ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں مرزا غالب کے مزار کو میر جا غالب کا مزار لکھا گیا ہے جو کہ سراسر غلط ہے جس کا سوشل میڈیا پر کافی مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ادھر محمد اسماعیل مارگ کو 'اسماعیل مارگ' لکھا گیا ہے، نجف خان کو 'نزف خان' اور اوکھلا کو 'اوخلا' لکھنے کی جسارت کی جاتی ہے۔ اردو ناموں سے نقطے غائب، تشدید کا لاپتہ ہونا، زیر زبر غائب اور جزم پیش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اگر یہی غلطیاں ہندی اور پنجابی کے علاوہ انگریزی رسم خط میں ہو جائے تو یقیناً طوفان اٹھے گا۔ ہندی، پنجابی اور انگریزی کے علاوہ سرکاری انتظامیہ کی نیند حرام کر کے رکھ دیں گے۔ اردو کے علاوہ جن زبانوں میں راستوں کے ناموں کی تختیاں بنائی جاتی ہیں ان میں کسی قسم کی غلطی نہیں ہوتی اور اگر ہے تو صرف اردو کے ساتھ۔ بطور مثال تغلق آباد دیکھ تحریر ہے، اسے بعض مقامات کیا بیشتر جگہوں پر تغلقا باد لکھا گیا ہے، ایسے ہی مصطفیٰ کمال اتاترک روڈ کی جگہ مصطفے لکھ دیا گیا ہے، ایسے ہی حضرت نظام الدین اولیا لکھنے کی بجائے صرف نظام الدین اولیا لکھا گیا ہے جب کہ آج بھی ٹرین اور ریلوے اسٹیشن کا مکمل نام حضرت نظام الدین ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کی توجہ مبذول کرواتے ہوئے اردو احباب نے کہا کہ افسوس اس بات کا ہے کہ اس دارالحکومت جسے اردو کا دبستان تسلیم کیا گیا ہے، مرکزی اور آفاقی حیثیت ہر عہد میں تابندہ رہی ہے، بستے اور اجڑتے رہنے کی گواہ اس دہلی میں لاکھوں اہل اردو آباد ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو زبان کو کبھی بھی ختم نہیں ہونے دیا جائے گا

سردار کلتار سنگھ

مالیرکوٹلہ (26 فروری)۔ اردو کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے پنجاب اسمبلی کے اسپیکر سردار کلتار سنگھ سندھواں نے کہا کہ اردو ایک میٹھی زبان ہے جو کہ پنجاب میں پیدا ہوئی مگر جس کے بارے میں آج یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ زبان ختم ہو رہی ہے، میں یقین دلاتا ہوں کہ اس زبان کو کبھی بھی ختم ہونے نہیں دیا جائے گا۔ انھوں نے ان خیالات کا اظہار پنجاب اردو اکیڈمی مالیرکوٹلہ کی سالانہ تقریب تقسیم انعامات و اعزازات میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس تقریب میں شرکت کر کے مجھے بے حد مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ آئندہ بھی مجھے ایسی ادبی تقاریب میں ضرور بلایا کریں۔ کچھ لوگ زبانوں کو مذہب کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ بہت ہی غلط بات ہے کیوں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ زبان ہر ایک مذہب کے ماننے والوں کی ہوتی ہے۔ زبان ہو یا پھر سیاست، ان دونوں کو کسی بھی مذہب سے نہیں جوڑنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ پنجابی ہماری ماں بولی زبان ہے تو اردو ہماری خالہ زاد زبان ہے۔ عزت مآب اسپیکر صاحب نے کہا کہ پنجاب اردو اکیڈمی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ پنجاب اردو اکیڈمی کی بہترین اور حوصلہ کن کارکردگی سے خوش ہو کر انھوں نے اکیڈمی کو پانچ لاکھ روپے دینے کا اعلان بھی کیا جس سے محبان اردو میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سبھوں نے تالیوں کے ساتھ انھیں داد و تحسین پیش کی۔

اس سالانہ تقریب کی صدارت فرما رہے ڈاکٹر محمد جمیل الرحمن (آئی پی ایس، مالیرکوٹلہ وائس چیئرمین پنجاب اردو اکیڈمی) نے کہا کہ سندھواں صاحب کی اپنی مصروفیات کے باوجود آج کی اس تقریب میں شرکت کرنا ان کی اردو سے دوستی اور دلچسپی خصوصاً پنجاب بالخصوص مالیرکوٹلہ شہر سے محبت کا زندہ ثبوت ہے۔ انھوں نے اردو اکیڈمی کی کارکردگی کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکیڈمی کی جانب سے آئے دن پنجاب کے کسی نہ کسی خطے میں اردو تقریب کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔ آج کی اس تقریب میں دیے جانے والے انعامات و اعزازات کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اکیڈمی کی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہونے جا رہا ہے کہ اکیڈمی کی جانب سے اردو کے ادبا و شعرا کو اعزازات سے نوازا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اکیڈمی کی جانب سے پنجاب کے آٹھ اضلاع میں پہلی مرتبہ قائم کیے گئے اردو تعلیمی مراکز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پورے پنجاب میں اردو کی درس و تدریس کو فروغ دیا جا سکے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کی اس تقریب میں شعرا و ادبا کے ساتھ ساتھ طلبہ و طالبات کو بھی اردو مضمون میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر نقد انعامات و اعزازات سے نوازا جائے گا۔ ڈاکٹر جمیل الرحمن نے مزید کہا کہ اکیڈمی کی جانب سے طبع شدہ کتب کی اجرائی بھی آج کی اس تقریب میں کی جائے گی اور اس سال جو کچھ بھی اکیڈمی کی جانب سے اردو کے فروغ کے لیے کیا گیا آئندہ سال اس سے کہیں بڑھ کر کیا جائے گا۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

تمام سرکاری دفاتر میں اردو زبان کے نفاذ کو یقینی بنائیں

سدی پیٹ (8 مارچ)۔ شیخ احمد ایاز (ایڈوکیٹ و جنرل سکریٹری آل تلنگانہ مسلم ایڈوکیٹس فورم) نے اپنے صحافتی بیان میں صدرنشین اردو اکیڈمی مسٹر طاہر بن حمدان کے ارسال کردہ ان مکتوبات کی ستائش کی جن میں انھوں نے ضلع کلکٹرس سے خواہش کی کہ وہ اپنے ضلعی دفاتر اور تحت کے دفاتر میں اردو کو بطور دوسری سرکاری زبان استعمال کرنے کا رواج ڈالیں۔ شیخ احمد ایاز نے مزید کہا کہ ہر محب اردو، اردو زبان کی ترویج کے لیے مخلصانہ سعی کرے اور اپنی اولاد کو انگلش میڈیم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر میں اردو زبان بھی سکھائے تاکہ اس شیریں زبان کی چاشنی اور لطافت سے نئی نسل کما حقہ واقف ہو جائے۔ اپنے گھروں میں اردو اخبارات منگوائیں۔ ہر فرد جو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اردو کا سپاہی خواہ ہے وہ اپنی جیب سے کچھ نہ کچھ اردو پر خرچ کرے۔ اردو کے رسائل، جرائد و اخبارات کا خریدار بنے۔ شیخ ایاز احمد نے اردو کے بہی خواہوں اور سرکاری اداروں کے ذمے داروں سے اپیل کی ہے کہ ایسے افراد جو اردو کے مشاعروں اور مرحوم شعرا کے نام پر اپنے مفاد کے لیے چندے اور عطیات وصول کرتے ہیں، ان کی خود ساختہ اور فرضی انجمنوں کا گزشتہ سالوں کا حساب کتاب پوچھیں اور حکومتی اداروں پر دباؤ بنائیں کہ وہ ایسی خود ساختہ تنظیموں کے خود غرض منتظمین کا احتساب کرتے ہوئے انھیں بند کروائیں۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

مہاراشٹر میں اردو اساتذہ کے عہدوں پر مراٹھی اور انگریزی اساتذہ کی تقرری

ممبئی (12 مارچ)۔ گزشتہ ماہ مہاراشٹر کی ریاستی حکومت کے پورٹل کے ذریعے برہن ممبئی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ تعلیم کی جانب سے مختلف میڈیم کے اساتذہ کے عہدوں کے لیے ایک فہرست جاری کی گئی جس میں حیرت انگیز طور پر اردو میڈیم کی ششم تا بارہویں جماعت کے اساتذہ کی 58 اسامیوں میں سے صرف 4 اسامیوں پر ہی اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے امیدواروں کے نام شامل ہیں۔ اس معاملے پر این سی پی (اجیت پوار) کے ریاستی نائب صدر سلیم سارنگ نے احتجاج کرتے ہوئے اردو زبان کے طلبہ سے ہونے والے کھلواڑ اور اردو اساتذہ کی حق تلفی پر برہمی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ اردو اساتذہ کی ان اسامیوں کے لیے ضابطے کو طاق پر رکھتے ہوئے مراٹھی، انگریزی کے امیدواروں کو غیر قانونی طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ جن امیدواروں نے درخواست فارم میں اردو زبان کو ترجیح کے طور پر بھی منتخب نہیں کیا تھا، ان کا تقرر بھی اردو اسکولوں میں کر دیا گیا ہے۔ یہ مضحکہ خیز ہے کہ جن امیدواروں نے مراٹھی اور انگریزی کے تحت اپنی پہلی زبان کے طور پر اسکول کا امتحان پاس کیا ہے انھیں اردو میڈیم میں پڑھانے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ تو سنسکرت پڑھانے کے لیے کسی مسلمان مولوی کی خدمات حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ کیا یہ اردو میڈیم اسکولوں کو مکمل طور پر ختم کرنے کی سازش ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایک طرف اردو اسکولوں کے لیے پیکج کا اعلان کیا جاتا ہے تو دوسری طرف زبان کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ سلیم سارنگ نے اس ضمن میں ریاستی وزیر تعلیم دیپک کیسرکر کو ایک تحریری شکایت بھیجی ہے کہ وہ ذاتی طور پر اس لاقانونیت کا جائزہ لیں اور اردو کے مستحق امیدواروں کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں کو دور کریں نیز اردو اساتذہ کو ان کا حق دیا جائے۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

تلنگانہ اردو اکیڈمی کے انعام یافتہ 214 اساتذہ 6 ماہ سے انعامی رقم سے محروم

حیدرآباد (یکم مارچ)۔ تلنگانہ حکومت نے عبوری بجٹ میں اقلیتی بہبود کے لیے 2300 کروڑ روپے مختص کرتے ہوئے مختلف اسکیموں پر عمل آوری کی عہدیداروں کو ہدایت دی۔ گزشتہ اوورسیز اسکالر شپ، اردو میرٹ اسکالرشپ اور شادی مبارک جیسی اسکیموں کے لیے محکمۂ اقلیتی بہبود نے بجٹ جاری کیا۔ حکومت کی تبدیلی کے باوجود تلنگانہ اردو اکیڈمی کی کارکردگی میں کوئی سدھار نہیں ہوا ہے۔ حکومت نے اگرچہ اردو اکیڈمی کے لیے بھی فنڈ مختص کیے لیکن اردو اکیڈمی سے بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ حاصل کرنے والے اساتذہ گزشتہ چھے ماہ سے انعامی رقم سے محروم ہیں۔ واضح رہے کہ تلنگانہ اردو اکیڈمی نے گزشتہ سال 6 اگست کو تین سال کے بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈس کے تحت 214 اساتذہ کو انعامی رقم کے طور پر 25000 روپے کے کاغذی چیکس حوالے کیے تھے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے 214 اساتذہ کے اکاؤنٹ میں چھے ماہ گزرنے کے باوجود انعامی رقم جمع نہیں کی گئی۔ اس سلسلے میں انعام یافتہ اساتذہ نے جج کمیٹی کے عہدیداروں سے ربط قائم کیا تو انھیں اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ انعام یافتہ اساتذہ نے انتباہ دیا ہے کہ اگر انعامی رقم فوری جاری نہیں ہوئی تو وہ جج کمیٹی کے روبرو احتجاج پر مجبور ہو جائیں گے۔ انعامی رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں سکریٹری سے بھی ملاقات کی گئی ہے۔ اقلیتی اداروں کی کارکردگی کے بارے میں پہلے ہی عوام میں بہتر تاثر نہیں ہے، ایسے میں انعام یافتہ اساتذہ کو چھے ماہ سے انعامی رقم سے محروم رکھنا اردو اساتذہ کی توہین ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

مولانا آزاد نے اردو صحافت کو زمانے کی رفتار سے آنکھیں چار کرنے کا سلیقہ سکھایا: معصوم مرادآبادی

مانو لکھنؤ کیمپس میں مولانا آزاد کی صحافتی خدمات کے موضوع پر توسیعی خطبے کا انعقاد

لکھنؤ (22 فروری)۔ مولانا آزاد نے اردو صحافت کو اس معراج پر پہنچایا کہ وہ دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی صحافت کے ہم پلہ قرار پائی۔ انھوں نے اردو صحافت کو نہ صرف ایک عظیم مشن اور مقصد کی راہ پر ڈالا بلکہ اسے زمانے کی رفتار سے بھی آنکھیں چار کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز صحافی جناب معصوم مرادآبادی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں مولانا آزاد کی یوم وفات کی مناسبت سے منعقد توسیعی خطبے کے دوران کیا۔ وہ 'مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات' کے موضوع پر کیمپس میں توسیعی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ خطبے کی صدارت اردو کے ممتاز ادیب اور دانشور ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے فرمائی۔ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر ہما یعقوب نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ شکریہ ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی نے ادا کیا۔ کیمپس کے طالب علم محمد اشرف علی نے قرآن پاک کی تلاوت اور ترجمہ پڑھا۔

معصوم مرادآبادی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کو ہم کئی حیثیتوں سے جانتے ہیں، لیکن ان میں صحافت ایک ایسا میدان تھا، جہاں ان کی موجودگی سب سے زیادہ محسوس کی گئی۔ صحافت ان کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا ذریعہ نہیں بنی بلکہ خود ان کے افکار، طرزِ نگارش، منفرد اسلوب اور جدت طرازی نے اسے بام عروج تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت کو ان کی فطرت ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے توسیعی خطبہ میں کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد پر اخبار نویسی کو اختیار کرنے سے پہلے اس کے خدوخال واضح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں ترقی حاصل کرنے کے علاوہ آزادی کے حصول کے لیے عوام الناس میں بیداری اور شعور پیدا کرنے کا کام صحافت سے جس موثر انداز میں لیا جا سکتا ہے اتنا کسی دوسری چیز سے نہیں لیا جا سکتا۔

معصوم مرادآبادی نے کہا کہ مولانا آزاد جس بے پناہ عبقری شان کے ساتھ مطلع صحافت پر طلوع ہوئے تھے وہ کسی عام صحافی اور اخبار نویس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ انھوں نے اصولوں، اقدار اور بلند مقاصد کو اپنا شیوہ بنایا تھا اور صحافت میں تین بنیادی اصولوں کے طرفدار تھے۔ اول یہ کہ اخبارات کو سماج کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ دوم اخبارات کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا پیغام عام ہونا چاہیے اور سوم اخبار نویسی کے ذریعے عوام میں جدید ترین علوم و فنون کا فروغ ہو۔

معصوم مرادآبادی نے کہا کہ مولانا آزاد صحافت کے مشن میں کسی بھی آلائش اور ذاتی مفاد کے مخالف تھے اور اخبار نویس کے قلم کو پوری طرح آزاد اور بے باک دیکھنا چاہتے تھے۔

صدارتی خطاب میں ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے کہا کہ مولانا آزاد خود ایک تاریخ تھے۔ انھوں نے جس میدان میں قدم رکھا اسے بام عروج تک پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد اردو صحافت کا معیار اور اعتبار دونوں ہیں۔ اس موقع پر کیمپس کے اساتذہ و ریسرچ اسکالر اور طلبہ کے علاوہ شہر نگاراں کی اہم شخصیات میں حکیم وسیم احمد اعظمی، پروفیسر جمال نصرت، کی جلیل قادری، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، قطب اللہ، مجیب عالم خاں، منظور وقار، اویس سنبھلی، ... پرکاش ساحر، راشد خاں، ضیاء اللہ صدیقی، عمیر ادائیہ وغیرہ موجود تھے۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر مظہر کبریا کی کتاب 'علامہ شبلی: کتابِ درد کا اقتباس' کا اجرا

پٹنہ (پریس ریلیز، 17 فروری)۔ میری نظر میں علامہ شبلی ایک قادر الکلام شاعر ہیں، جن کے یہاں کچھ خاص روایتوں کا اظہار ملتا ہے۔ ان روایتوں کا تعلق اخلاقیات اور تاریخ و تہذیب سے ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں علامہ شبلی سے جب بھی ملا ایک مسرت کا احساس ہے کہ وہ تمام ان کی شعری و نثری خدمات پر ڈاکٹر مظہر کبریا نے اس کتاب میں تقریباً تمام ہے مضامین جمع کر دیے ہیں۔ واضح ہو کہ آج شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر مظہر کبریا کی کتاب 'علامہ شبلی: کتابِ درد کا اقتباس' کی رسم رونمائی اور ادبی مذاکرے کی محفل منعقد کی گئی تھی، جس کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، جناب جاوید ہمایوں، جناب ارشد فیروز اور ڈاکٹر مظہر کبریا نے شرکت کی۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے تعارفی و استقبالیہ کلمات ادا کیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے کہا بنیادی طور پر تخلیق کار ترقی پسند ہوتا ہے۔ علامہ شبلی کسی تنظیم سے وابستہ نہیں تھے مگر ذہنی طور پر ہمیشہ ترقی پسند رہے۔ جناب جاوید ہمایوں نے کہا کہ مظہر کبریا نے ایک دستاویزی کتاب مرتب کی ہے۔ ہندوپاک کی تقسیم اور متعدد واقعات کے علاوہ ترقی پسندی کے زوال کا اثر علامہ شبلی کی شاعری پر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ تقسیم ہند سے جدیدیت تک بدلتے ہوئے شعری اسالیب اور رجحانات کا آئینہ علامہ شبلی کی شاعری ہے۔ وہ معاشرے سے مثبت اقدار، انسانیت اور محبت کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسان کے وجود کا اظہار ہوتی ہیں۔

جناب ارشد فیروز صاحب نے کہا کہ اردو سے محبت ہماری تہذیب سے محبت ہے۔ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی اردو زبان و ادب کے فروغ اور محبت کی علامت و علامت ہے۔ یہاں کے طلبہ خوش نصیب ہیں جو اس زبان سے وابستہ ہمارے سب سے متحرک شعبے سے وابستہ ہیں۔ علامہ شبلی اس حیثیت سے بھی خوش نصیب تھے کہ انھیں اردو سے پیار کرنے والے صاحبزادے ملے۔ جناب مظہر کبریا نے کہا کہ میں خوش نصیب ہوں کہ اپنے محبوب شعبے میں کتاب کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس شعبے نے ہمیں صرف تعلیم نہیں دی ساتھ ہی تہذیب و تربیت بھی عطا کی ہے۔ میری کتاب کا اجرا یہاں ہونا میرے لیے قابل فخر ہے۔ علامہ شبلی بھی میری نظر میں ایک تہذیب کا نام ہے۔ وہ منکسر المزاج، وضع دار اور نرم مزاج انسان تھے اور ویسا ہی انھوں نے مجھے بننے کی ترغیب دی۔ میرے آئیڈیل پروفیسر اعجاز علی ارشد اور علامہ شبلی رہے ہیں۔ میں آج بھی ان کی راہ پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آخر میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، جب کہ جناب شاہد وصی اس پروگرام کی نظامت کر رہے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر عمیر رضا، ڈاکٹر نزہت صبوحی اور ڈاکٹر مسرت جہاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے میں ڈاکٹر سرور عالم ندوی، ڈاکٹر انور الہدیٰ، ڈاکٹر اسلم، ڈاکٹر عارف حسین، جناب شکیل سہسرامی، ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ، ڈاکٹر شکیل انور، پرویز عالم اور جناب انور اللہ کے علاوہ طلبہ، طالبات اور ریسرچ اسکالروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام رسالہ : ماہنامہ 'انشاء' کا 28 واں خاص شمارہ
(بچوں کے بہترین ہندی فلمی گیت 2022-1947)
مدیر : ف س اعجاز
ضخامت : 72 صفحات
قیمت : 50 روپے
ملنے کا پتہ : انشاء پبلی کیشنز، 25 بی، ذکریا اسٹریٹ، کولکاتا 700073 (مغربی بنگال)
تبصرہ نگار : ڈاکٹر بدر محمدی
Email : badrmohammadi1963@gmail.com

ماہنامہ 'انشاء' کولکاتا، انتالیس سالوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ان 39 برسوں میں اس کے 28 خصوصی شمارے منظر عام پر آچکے ہیں اور ہر خاص شمارہ واقعتاً خاص شمارہ رہا ہے۔ حالیہ خاص شمارہ بابت نومبر۔دسمبر 2023 'بچوں کے بہترین ہندی فلمی گیتوں' پر مبنی ہے۔ اس میں 1947 سے 2022 تک کے 90 گیت شامل ہیں جو بچوں سے متعلق مدیر 'انشاء' ف س اعجاز کی نظر میں بہترین گیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں اردو کے گیت بھی ہیں لیکن ہندی فلمی گیت اس لیے کہا گیا ہے کہ ہندستانی فلموں کو ہندی فلم کا ہی سرٹیفکٹ ملتا ہے۔ وہ ان گیتوں کے حوالے سے ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، نور لکھنوی، راجہ مہدی علی خاں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے گانے شامل ہیں۔ بچوں کے گیت کاروں میں شیلندر، پریم دھون، راجندر کرشن، گلزار اور آنند بخشی کے نام بھی بطور خاص شامل ہیں۔ ان گیتوں کو میوزک دینے والوں میں نوشاد، اسلم سورتی، سلیل چودھری، ہیمنت کمار، سی رام چندر، روی، شنکر جے کشن، ایس ڈی برمن، روشن، بھرتی، خیام، مدن موہن، چتر گپت، لکشمی کانت پیارے لال، وسنت دیسائی، کلیان جی آنند جی، راہل دیو برمن، روشن، جتن پنڈت، للت پنڈت، وشال بھاردواج، او پی نیر کے نام شامل ہیں اور انھیں مدھر آواز دینے والوں میں محمد رفیع، لتا منگیشکر، آشا بھونسلے، اوشا منگیشکر، مکیش، کشور کمار، نوتن، شمشاد بیگم، سی رام چندر، منا ڈے، گیتا دت اور سدھا ملہوترا کے نام قابل ذکر ہیں۔

فلمی دنیا کی باتیں ماہنامہ 'انشاء' میں پہلے بھی ہوتی رہی ہیں۔ متعدد موضوع پر خصوصی شمارے پہلے بھی شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً راجندر کرشن نمبر، گلزار نمبر، مگر موجودہ خاص شمارہ ان سب سے علاحدہ ہے کہ اس میں بچوں کے بہترین فلمی گیتوں کا تذکرہ ہے۔ فلم پیغام رسانی کا وسیلہ ہے۔ اس کی کہانی میں ہی نہیں گیت میں بھی پیغام ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ لطف اندوز فلم کے گانے سے ہوا جاتا ہے جس کی گونج برسوں تک اور دور تک سنی جاتی ہے۔ فلم کی کہانی اور گیت ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ گیت کے بغیر فلم بے نمک کھچڑی کی طرح ہے۔ گیت خوشی کا بھی ہوتا ہے اور غم کا بھی اور ہر دو کا سبب کوئی نہ کوئی ہے۔ بچے بھی روتے اور گاتے ہیں۔ ان سے متعلق کوئی گیت ہو تو بچے انھیں بار بار سنتے اور پسند کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ایسے گیت دوسری عمر کے لوگوں کو بھی پسند ہوتے ہیں۔ ف س اعجاز نے ایسے تمام گیتوں کا ذکر اس خاص شمارے میں کیا ہے۔

ادب کا ایک حصہ ادب اطفال کا بھی ہے۔ ادب اطفال کی نشر و اشاعت پر کم ہی لوگوں نے توجہ دی ہے۔ ف س اعجاز نے ادب اطفال سے قربت دکھائی ہے مگر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ بچے بھول ہوتے ہیں کہ دوسرا مسکراتے رہتے ہیں۔ ان کے من میں میل نہیں ہوتا۔ وہ ایک پل جھگڑتے ہیں تو دوسرے پل پھر دوست بن جاتے ہیں۔ بچے زمین کے تارے ہیں۔ لہٰذا بچوں کے ذکر اور ان کے گیتوں کے تذکرے میں روشنی پائی جاتی ہے۔ ف س اعجاز نے بڑی ہنرمندی سے اس روشنی کو یکجا کیا ہے تاکہ دنیائے ادب میں اجالا پھیلے۔ زیر نظر خاص شمارے کے صفحات عام شمارے کے صفحات سے زائد ہیں۔ قیمت عام شمارے والی ہی ہے۔ 'احوال و اخبار' اور 'آپ کی ڈاک' کے کالم بھی حسب معمول ہیں لیکن جو چیز اس شمارے کو عام شماروں سے الگ کرتی ہے وہ ہے بچوں کے منتخب فلمی گیتوں کی پیشکش۔ شاعر، سنگیت کار، گلوکار اور فلم کے نام کے ساتھ گیت سے متعلق فلم کی منتخب تصویری جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ سرورق پر درج تصویر بھی بچوں کے لیے دامن کش ہے۔ ان ساری چیزوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی کیا نوعیت ہے؟ ان میں کیا بات ہے؟ کیا سبق اور پیغام ہے؟ اس باب کا آغاز 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری' سے ہوا ہے اور اختتام راجہ مہدی علی خاں کے گیت 'سکندر نے پورس سے کی تھی لڑائی' سے۔ ماہنامہ 'انشاء' کے خاص شمارہ 'بچوں کے بہترین ہندی فلمی گیت' کا اہم حصہ اس میں شامل تین مضامین سے وابستہ ہے۔ پہلا مضمون 'گفتنی' کے تحت 'متبادل ادب' کے عنوان سے تحریر ایک صفحے کے اداریے میں ف س اعجاز نے لکھا ہے کہ بچوں کے ہندی فلمی گیتوں کا یہ معیاری انتخاب انھوں نے بڑے مقصد سے پیش کیا ہے۔ اس طرح کا کام پہلی بار ہوا ہے۔ یہ کام انھوں نے ایک نظریے کے تحت کیا ہے۔ لہٰذا اسے سطحی کام نہیں کہا جاسکتا کہ انھیں پڑھنے کے بعد ثقافتی تناظر میں ان سدابہار گیتوں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فنون لطیفہ کی اقسام کی تشریح کرتے ہوئے مصوری کے زمرے میں فلم سازی، فوٹوگرافی اور ویڈیوگرافی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ بچوں کی شاعری میں دستیاب کئی کتابوں سے یہ انتخاب زیادہ بہتر ہے اور متنوع بھی۔ غرض کہ ف س اعجاز نے اپنی اداریہ تحریر میں اس خاص شمارے کی نوعیت، اہمیت، افادیت اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس انتخاب کو متبادل ادب قرار دیا ہے۔ اس امتیازی عمل کو جدید صحافت کے زمرے میں رکھا ہے۔

اداریے کے بعد دوسرا مضمون بھی مدیر ف س اعجاز کا تحریر کردہ ہے جس کا عنوان ہے 'بچوں کے ہندی فلمی گیت: 1947 سے 2022 تک'۔ یہی عنوان خاص شمارے کا بھی ہے۔ یہ تحریر اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی مضمون ہے جس سے گیتوں کے فنی، تخلیقی، تعلیمی، جذباتی اور قومی حیثیت اجاگر ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ف س اعجاز نے 'بچپن' کی بات کی ہے۔ بچوں کی فطرت پر تبصرہ کیا ہے۔ لوری کی خوبی بتائی ہے۔ مثالوں کے ساتھ اپنی بات رکھی ہے۔ اسی ضمن میں موسیقی کی اہمیت سے بھی واقف کرایا ہے۔ ف س اعجاز نے لکھا ہے کہ گانے اور گیت کا کام ناظرین کو تفریح اور تسکین پہنچانا ہے مگر اس سے شخصی، گھریلو، اجتماعی اور تعلیمی زاویے بھی روشن ہوتے ہیں۔ مدیر نے مقصدیت آمیز گیتوں کا ذکر کیا ہے اور پھر بچوں سے تخاطب والے گیتوں کا بیان بھی۔ ایسے گیت جو فلم کے لیے لکھے گئے اور ایسے گیتوں کا ذکر بھی ہے جنھیں ادب سے فلم میں لایا گیا ہے۔ بچوں میں جوش و ولولہ بھرنے والے گیت، انھیں متحرک اور فعال بنانے والے گیت، وطن پرستی اور خدمت قوم سے متعلق گیت۔ ف س اعجاز نے اپنی تفصیلی گفتگو میں مختلف گیتوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس شمارے میں انھوں نے کلکتہ کے انگریزی و ہندستانی شاعر، مصنف، اداکار، ہریندرناتھ چٹوپادھیائے کا بھی ذکر 'آشیرواد' کے حوالے سے کیا ہے۔

تیسرا اور آخری مضمون جمیل گریڈیہ کا ہے۔ دو صفحات پر مشتمل اس مضمون کا عنوان ہے 'میرے پسندیدہ بچوں کے فلمی گیت'۔ ان کے پسندیدہ گیتوں میں وہ گیت شامل ہیں جنھیں انھوں نے بچپن میں سنے اور بچپن ختم ہونے کے بعد آج بھی وہ گیت ان کے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ جناب گریڈیہ نے اپنے والد گرامی صحافی، شاعر اور افسانہ نویس عابد گریڈیہ کا ذکر کیا ہے کہ انھیں اپنے بچوں کو فلم دکھانے کا شوق تھا۔ جمیل گریڈیہ نے پہلے نمبر پر والد محترم کے ساتھ دیکھی گئی فلم 'طوفان اور دیا' کے گیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ گیت ہے [illegible]۔ اس کے بعد گریڈیہ نے فلم 'جاگرتی' کے گیت 'سابرمتی کے سنت تو نے کر دیا کمال' کا ذکر کیا ہے۔ بچوں کے جس گیت میں انھیں معصوم آواز اور اثر انگیزی دکھائی دیتی ہے وہ ہے 'نانی تیری مورنی کو مور لے گئے، باقی جو بچا تھا کالے چور لے گئے'۔ فلم 'بوٹ پالش' کے گیت 'ننھے منے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے' کا ذکر بھی کیا ہے۔ گریڈیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ 'بچے من کے سچے، سارے جگ کی آنکھ کے تارے' کا اثر پردے پر دیکھنے سے زیادہ سننے سے ہوتا ہے۔ 'چھن چھن کرتی آئی چڑیا' ان کی نظر میں ایسا گیت ہے جس کی مٹھاس کبھی ختم نہیں ہونے والی ہے۔ انھوں نے 'ننھا منا راہی ہوں' (سن آف انڈیا)، 'دادی اماں دادی اماں مان جاؤ' (دادی ماں)، 'آؤ بچو تمھیں دکھائیں جھانکی ہندستان کی' (جاگرتی)، 'ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے' (جاگرتی) جیسے بچوں کے گیت کے ساتھ ساتھ 'چندا ماما دور کے' جیسی چند لوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ گریڈیہ نے اپنی بات شیلندر کے ذکر پر ختم کی ہے کہ شیلندر آسان الفاظ میں زندگی کے فلسفے سناتے تھے۔ جمیل گریڈیہ نے اپنی تحریر میں انگریزی کی طرف جھکاؤ کے تئیں اندیشے کا اظہار کیا ہے۔

'انشاء' کولکاتا کے خاص شمارے بعنوان 'بچوں کے بہترین ہندی فلمی گیت' میں تین ہی مضامین ہیں مگر یہ تینوں فکر انگیز تحریریں ہیں۔ البتہ اور بھی مضامین ہوتے تو یہ شمارہ مزید وقیع اور جامع ہوتا۔ اس خاص شمارے میں چھان بین اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے گیتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی طرح قابل قبول ہوں اور تہذیب کے دائرے میں ہوں۔ ان گیتوں کو اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں گایا جاسکتا ہے۔ یہ گیت خوشگوار آہنگ پیدا کرتے ہیں کہ یہ کسی عمر کے گائے ہوئے گیت ہیں۔ یہ گیت ثقافتی سرمایہ ہیں۔ ان میں بچوں کی شوخی اور شرارت بھی ہے اور ہمدردی، سبق، نصیحت، سماجی و تعلیمی پیغام بھی۔ اس خاص شمارے میں عمر اور زبان کے تقاضوں کی تکمیل ہے۔ ان منظومات سے بچے استفادہ کرسکتے ہیں اور وہ بچے بھی محظوظ ہوسکتے ہیں جو عمر رسیدہ انسان کے اندر چھپے ہوتے ہیں۔ موجودہ سماج میں بچے بزرگوں کی شفقت اور فلم سازوں کی توجہ سے محروم ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں ف س اعجاز کی یہ پیش کش لائق تحسین ہے۔ فلموں سے ان کی ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس دلچسپی میں وہ اوروں کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔

•••

بقیہ: ارضِ گورکھپور کی مٹی کا شاعر ظفر گورکھپوری

(صفحہ 2 سے آگے)

بچوں پالوں کو اٹھائے محفوظ مقام کی جانب کوچ کرنے لگے۔ آخر دیکھتے ہی دیکھتے منظر سیلاب زدہ ہوگیا۔ گھر پانی بیٹھنے لگے، بالخصوص میرا اپنا گھر پوری طرح تباہ و تاراج ہوگیا۔ سچ ہے یہ خواب مجھے بے چین کیے ہوئے تھا اور وہ میرے ضمیر کو کچوکتا رہا۔ یہ خواب کس سے ساجھا کرتا، بیوی، بیٹا، بیٹی سب مذاق بناتے، اچانک تم یاد آئے اور میں بے سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑا۔" پھر انھوں نے انتہائی بے چارگی کے عالم میں یہ شعر پڑھا

باڑھ آئی تھی ظفر لے گئی گھر بار مرا
اب کسے دیکھنے جاؤں میں وطن بارش میں

ظفر صاحب جب سے اندھیری شاستری نگر کے فلیٹ میں منتقل ہوئے تھے کبھی کبھار ہی آتے، جب بھی آتے ساتھ خالد ہوتا۔ خالد کے سعودی عرب چلے جانے کے بعد یہ ذمے داری امتیاز کے سر آگئی تھی جسے وہ طوعاً و کرہاً نبھاتا تھا۔ شاید اسی سبب ظفر صاحب کا گھر سے رشتہ کٹنے لگا تھا۔ چند مہینوں بعد شوگر بڑھنے کے باعث میرا ابھی ان کے یہاں آنا جانا بند ہوگیا تھا۔ اسی دوران معلوم ہوا کہ اُن کی ٹانگوں کی جانب کا دائرہ وسعت ہوگئی ہے جس کا انھیں شدید صدمہ پہنچا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ صدمہ سر میں سمایا اور پھر درد بن کر انھیں تڑپانے لگا۔ درد جب ناقابل برداشت ہوا تو ڈاکٹر نے ایم آر آئی کروایا۔ رپورٹ نے اطلاع دی کہ دماغ کی ایک رگ متاثر ہوگئی ہے۔ نتیجتاً جلدی جلدی آپریشن کی تیاریاں کی گئیں اور پھر سر میں گھر اور گاؤں کی مٹی کا جو سودا سمایا ہوا تھا اُسے کھرچ کر ڈاکٹر نے نکال باہر کیا۔

آپریشن کے بعد میں انھیں دیکھنے ہسپتال گیا تھا۔ وہ آئی سی یو میں بے حس و حرکت پڑے خلا میں یوں تک رہے تھے گویا کہہ رہے ہوں

مٹی تجھ سے کیا رشتہ ہے جس دن ہم نے چھوڑا گاؤں
دیر تلک دیواریں روئیں، دور تلک ساتھ آیا گھر

اشتیاق سعید

B-01, New Mira Paradise, Geeta Nagar,
Phase-2, Mira Road, Thane-401107
E-mail: ishtiyaquesaeed@rediffmail.com

بقیہ: عہد ساز شخصیت جلیل ساز

(صفحہ 3 سے آگے)

الگ یہ بات کہ میں خوش نہیں پایا ہوں برسوں سے
مری تقدیر لیکن مجھ پر اکثر مسکرائی ہے
کوئی آئے گا آکر زندگی میں رنگ بھر دے گا
یہی امید ہر انسان کو جینا سکھاتی ہے

انھیں سسکتی ہوئی زندگی کا علم نہیں
بڑے گھروں میں جو سوتے ہیں پاؤں پھیلا کر
میں اپنے عہد سے آنکھیں چرا نہیں سکتا
تری یہ ضد کہ فقط میری سمت دیکھا کر

عشق وہ چیز ہے واعظ تجھے معلوم نہیں
ہوش مندوں کو یہ دیوانہ بنا دیتا ہے

'نکہت' میں ایسے اشعار کی تعداد بے شمار ہے جسے سنبھال کر رکھا جانا چاہیے۔ ساز صاحب نے ست پہت ناگپوری کے نام سے بھی طنز و ظرافت کے پیرائے میں دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ اب ناگپور کے ادبی حلقوں کی یہ ذمے داری ہے کہ ساز صاحب کے مزاحیہ کلام کو سنجیدگی سے یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کروائیں۔ ساز صاحب اس معاملے میں قدرے سست واقع ہوئے تھے۔ آخر میں ساز صاحب کا مشہور و مقبول وداعی گیت ملاحظہ فرمائیے۔ یہ نظم چھ بندوں پر مشتمل ہے۔

چلی میکے سے دلہن دے کے صد رنج و محن
اپنے ماں باپ کو اب داغِ الم دے کے چلی
رشتہ داروں کو جدائی کا وہ غم دے کے چلی
صبح امید آئی مگر شام جدائی ہو کر
گھر سے گھر والی چلی آج پرائی ہو کر
ہمت کے بھائی بہن دے کے صد رنج و محن
چلی میکے سے دلہن دے کے صد رنج و محن

چھوٹے جاتے ہیں عمر بھر کے ساتھی گھر میں
جانے والی ہے مری بیٹی پرائے گھر میں
دل نہیں چاہتا جانے کو مگر جانا ہے
ڈولی تیار ہے اب دوسرے گھر جانا ہے
ہے یہ دنیا کا چلن دے کے صد رنج و محن
چلی میکے سے دلہن دے کے صد رنج و محن

دل میں آہوں کا دھواں آنکھ میں ساون کی جھڑی
میرے اللہ یہ آئی ہے بھلا کیسی گھڑی
دل پھٹا جاتا ہے یہ دیکھ کے ماں کا دکھڑا
غیر کو سونپ دیا اپنے جگر کا ٹکڑا
اپنی امید کا دھن دے کے صد رنج و محن
چلی میکے سے دلہن دے کے صد رنج و محن

آئیں بھر بھر کے جگر تھام کے رونے والو
جان اب میرے غم ہجر میں کھونے والو
میری قسمت میں جو اس گھر سے جدا ہونا تھا
درد الفت کی بہرحال دوا ہونا تھا
اپنا جاتا ہے چمن دے کے صد رنج و محن
چلی میکے سے دلہن دے کے صد رنج و محن

تو جہاں بھی رہے آباد رہے شاد رہے
بیٹی لیکن یہ مری بات تجھے یاد رہے
اپنے خاوند کی مرضی پہ تجھے چلنا ہے
نئی سسرال کے سانچے میں تجھے ڈھلنا ہے
ہاں وہاں رہنا مگن دے کے صد رنج و محن
چلی میکے سے دلہن دے کے صد رنج و محن

ساز غمگین نہ ہو کیوں اپنے پرائے سارے
بن گئے پھول تمناؤں کے جب انگارے
الوداع حسن مکاں، روح مکاں، جان مکاں
پھیکی پھیکی سی ترے ہجر میں ہیں شانِ مکاں
عزت مرد و وطن دے کے صد رنج و محن
چلی میکے سے دلہن دے کے صد رنج و محن

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

خطبات شبلی	[illegible]	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	[illegible]	500/-
ادب (مشفق خواجہ)	محمد حامد	500/-
[illegible] کی ادبی کائنات	ریحان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق و تدوین	ڈاکٹر [illegible]	250/-
تنقیدی مباحث	[illegible]	300/-
[illegible]	شافع قدوائی	200/-
عہد وسطی کی ہندوستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	افتخار عالم خان	350/-
[illegible]	سید ضیاء حیدر	600/-
کتابیات حالی	ڈاکٹر [illegible]	200/-
[illegible]	ڈاکٹر ہلال نقوی	300/-
[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	360/-
[illegible] (مرزا محسن بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
[illegible]	فطرت انصاری	200/-
مکتوبات مولوی عبدالحق بنام [illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	700/-
[illegible] (کلیات زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-
[illegible] (کلیات افتخار عارف)	افتخار عارف	1500/-
گواہی (شاعری)	گوہر رضا	500/-
میری زمین کی دھوپ (ہندی)	[illegible]	400/-
[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	250/-
ٹیپو سلطان کا خواب (گریش کرناڈ)	مجیب الرحمان فاروقی	300/-
[illegible]	غلام حیدر	900/-
[illegible]	[illegible]	1000/-
In This Poem Explanateions of Many Modern Urdu Poem	[illegible] بیدار بخت	600/-
میری زمین کی دھوپ	[illegible]	600/-
اردو شاعرات اور نسائی شعور	ڈاکٹر [illegible] حسن	330/-
مجھے اک بات کہنی ہے	شاہد کمال	400/-
انتخاب غالب	امتیاز علی عرشی	600/-
[illegible]	افتخار عارف	300/-
[illegible]	سرور الہدیٰ	450/-
[illegible]	سرور الہدیٰ	500/-
[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	225/-
[illegible] علی گڑھ	پروفیسر [illegible]	400/-
[illegible]	معین الدین عقیل	100/-
[illegible]	بیدار بخت	700/-
[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	250/-
[illegible]	[illegible]	250/-
سرمایہ کلام	[illegible]	500/-

17 اگست 2007 کو ساز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے مگر ساز کے نغمات ہنوز زندہ ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے۔ بقول ساز مرحوم:

یہ زندگی ہے سفر صرف چند سانسوں کا
طویل اس کی مگر داستان کتنی ہے

ڈاکٹر محمد اظہر حیات

'حیات منزل' A-9، [illegible] ناگپور-440013

E-mail: mnafees29@rediffmail.com

علامہ شبلی کی والدہ مقیمہ بی بی

محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی نعمانی کی والدہ کا نام مقیمہ بی بی تھا۔ وہ موضع پھریہا ضلع اعظم گڑھ کے ایک رئیس حاجی قربان قنبر انصاری وکیل کی صاحبزادی اور مولانا حمید الدین فراہی کی سگی پھوپھی تھیں۔ بڑی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"مولانا (شبلی) کی والدہ ماجدہ حاجی قربان قنبر انصاری مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ نہایت نیک اور دین دار بی بی تھیں۔ تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں۔ مولانا اکثر اپنی والدہ مرحومہ کی نیکیوں کا ذکر فرمایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ ان کی سحر خیزی کی عادت انہی کے حسن تربیت سے پڑی۔" (حیات شبلی ص 126)

علامہ شبلی کو مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے تحصیل علم کے بعد ہندوستان کے ان یگانۂ عصر علما و فقہا اور محدثین سے استفادہ کرنے کا خیال پیدا ہوا جو اپنے علوم و فنون میں اپنے عہد میں ممتاز اور یکتائے روزگار تسلیم کیے جاتے تھے۔ اس کے لیے ان کے والد شیخ حبیب اللہ راضی نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اب علامہ شبلی وکالت کریں اور گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ اس موقع پر ان کی والدہ مقیمہ بی بی نے ان کی ہمت بندھائی اور ان کا ساتھ دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

"مولانا کی والدہ نے جو بہت باہمت خاتون تھیں، مولانا کی بے تابی شوق کو ناکام رکھنا گوارا نہ کیا۔ ان کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولانا نے طلب علم کے شوق میں دیار و وطن کی دلچسپیوں کو خیر باد کہا۔" (حیات شبلی ص 138)

مقیمہ بی بی شیخ حبیب اللہ وکیل کی پہلی بیوی تھیں۔ ان سے علامہ شبلی کے علاوہ محمد مہدی حسن، محمد اسحٰق، محمد جنید اور ایک بیٹی تولد ہوئے۔ بعد میں انھوں نے لکھنؤ میں دوسری شادی کر لی تھی۔ اس سے مقیمہ بی بی بہت دل گیر اور رنجیدہ رہا کرتی تھیں اور بالآخر اسی غم میں 1886 سے کچھ پہلے انتقال کر گئیں۔ اس سانحے سے علامہ شبلی بہت دل گرفتہ ہوئے۔ وہ جب کسی کی والدہ کی وفات کی خبر سنتے تو انھیں اپنی والدہ کی یاد آ جاتی تھی۔ مرثیہ محمد اسحٰق میں علامہ شبلی نے اپنی والدہ کے متعلق چند اشعار بھی کہے تھے جو بعد میں کسی وجہ سے خارج کر دیے۔ اس کا ایک مصرعہ بقول سید صاحب یہ تھا:

ماتم مادر دل گیر بھی دیکھا میں نے

صدر المنازل

علامہ نے اپنی والدہ کی یادگار میں نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں صدر المنازل کے نام سے ایک ہال تعمیر کرایا، جو اب بھی باقی ہے۔ یہ ہال شبلی نیشنل پی جی کالج میں صدر دروازے کے سامنے آفس کے عقب میں اب تک باقی ہے۔ اب اسے مقیمہ بی بی ہال کا نام دے دیا گیا ہے۔ اس پر یہ کتبہ اب بھی لگا ہوا ہے:

"ہو اللہ

ایں ایوان دل کشا کہ صدر المنازل ایں مدرسہ است

از زر عطیہ خاص

مولوی محمد شبلی صاحب

ملقب بہ

شمس العلما

سکریٹری ایں مدرسہ و فیلو آف یونیورسٹی الٰہ آباد

بہ یادگار

والدہ مرحومہ ایشاں تغمدہا اللہ بغفرانہ

چہارم دسمبر ۱۸۹۸، شعبان ۱۳۱۶ھ

تعمیر یافت"

دوسری والدہ سے جن کا نام معلوم نہیں ہو سکا علامہ شبلی کی سخت ناراضی اور دوری کا سبب بھی دراصل اپنی والدہ سے ان کی بے پناہ اور فطری محبت تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے 'حیات شبلی' میں لکھا ہے کہ:

"مولانا کے والد نے مولانا کی والدہ کی زندگی ہی میں ایک دوسری شادی کر لی تھی اور مولانا کو اس سے اس قدر اختلاف تھا کہ جب تک مولانا کے والد زندہ رہے انھوں نے اس مکان میں قدم نہیں رکھا جس میں یہ دوسری بی بی رہتی تھیں لیکن والد کے مرنے کے ساتھ ہی محبت اور انسانیت کے اقتضا سے مولانا نے خود اسی مکان میں قیام کیا اور باوجودیکہ مولانا کے دوسرے بھائی وکیل تھے اور مولانا سے زیادہ آمدنی رکھتے تھے لیکن مولانا نے خود اپنے وظیفہ سے ۳۰ روپے ماہوار ان کی تنخواہ مقرر کر دی اور اس کو برابر دیتے رہے۔" (حیات شبلی 707)

علامہ کو اپنی والدہ سے ایسا جذباتی تعلق تھا کہ وہ انھیں اور ان کی دلگیری کو کبھی بھلا نہ پائے اور جب ان کا ذکر آ جاتا تو تڑپ جاتے۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

"والدہ کے انتقال کو اگرچہ ایک مدت ہو چکی تھی لیکن مولانا کے دل میں اب تک ان کی محبت کی یاد تازہ تھی۔ فرماتے تھے کہ جب کبھی والدہ یاد آ جاتی ہیں تو تڑپ تڑپ جاتا ہوں۔" (حیات شبلی ص 707)

مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ بعض دوسرے اہل قلم نے بھی ان کی نیکی، شرافت اور خدا ترسی کا ذکر کیا ہے، مگر وہ سب دراصل 'حیات شبلی' ہی سے ماخوذ ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
شائستہ منزل، 641، پورہ غلامی، عقب آواس وکاس،
اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com
Mob. 9838573645

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، روڈگران، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by *Abdul Bari* on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi 110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: *Dr Ather Farouqui*